

دیاردل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

میں پانچ چھ برس کا بچہ تھا جبکہ ان کی بھرپور جوانی تھی۔ پورا فرنگی انڈیا ان سے مسور تھا۔ ہمارے ہاں ان کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ ضلع مظفر گڑھ میں ان کے مرید لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ میری پھوپھی نے بہت بعد میں مجھے بتلایا کہ ایک دن مشہور ہو گیا کہ امیر خریعت کو فرنگیوں کے کسی کارندے نے شہید کر دیا ہے۔ اس دن میرے والد صاحب، میاں خدا بخش ہاشمی شکار پر گئے ہوئے تھے۔ اور تو کچھ نہ سوچی میں نے اپنے والد صاحب کی تلوار اپنے کندھے پر رکھی جو میرے قد سے بھی بڑی تھی اور گھر سے باہر نکل پڑا اور زبان سے اعلان کیا کہ جس کسی نے بھی میرے چچا کو شہید کیا ہے آج میں اسے قتل کر دوں گا میری پھوپھی نے ملازمین کو کہا کہ فوراً جاؤ اور اس سے تلوار چھین کر اور پکڑ کر گھر واپس لاؤ۔ میں ابھی گھر سے کچھ فاصلے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ وہ لوگ پہنچ گئے اور مجھے زبردستی گھر لے آئے۔ میں سارا دن روتا رہا شام کو میرے والد صاحب گھر آئے انہیں جب حقیقت حال بیان کی گئی تو انہوں نے مجھے پیار کیا۔

پھر ایک روز مجھے بتایا گیا کہ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے تقریباً پانچ چھ سو میل دور، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جانا ہے ان دنوں یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ بڑے بڑے زمیندار اور پیسے والے لوگ بھی اپنے بچوں کو، صرف تعلیم کے لئے اتنی دور نہیں بھیجتے تھے۔ اور اگر بھیجتے بھی تھے تو میٹرک کے بعد۔ اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ تو فرنگی حکومت کے خلاف ایک ادارہ تھا۔ جہاں پنجاب کے بہت کم مسلمان زمیندار اپنے بچوں کو داخل کرانے کی حرات کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دور و نزدیک کے لوگ آکر میرے والد صاحب کو اس کام سے منع کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انہیں تو شاہ جی کے حکم کی پاسداری تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ بچوں کو انگریزی حکومت کے کسی بھی ادارے میں داخل کرانے کا نتیجہ انہیں غلامی میں پختہ کرنا تھا۔ اسی بنا پر تیسری جماعت تک کتابیں میں نے ایک پرائیوٹ استاد سے پڑھیں اور پھر چوتھی جماعت میں دہلی جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں ابتدائی مڈر سے کے استاد بھی ہائیڈ برگ، آکسفورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور جامعہ میں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خان جوان دنوں شیخ الجامعہ تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے صدر منتخب ہوئے، ابتدائی مڈر سے میں چھٹی جماعت کے بچوں کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

میرے جیسے اور بھی سینکڑوں ہزاروں بچوں اور ان کے والدین کو جامعہ ملیہ میں دلچسپی کی ترغیب دیتے۔ بعض لوگ بات مان لیتے اور بعض نہیں مانتے لیکن شاہ جی نے کبھی بھی جامعہ ملیہ میں جا کر وہاں کی انتظامیہ پر کوئی احسان نہ جتلیا کہ وہ ان کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خیر حضرات کو اس ادارے کے لئے

چندہ بھینسے کو بھی کہتے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جامعہ والوں کو بعد میں پتہ چلتا کہ وہ رقم کس کی معرفت وہاں پہنچی تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمام جنوبی ایشیا میں واحد عالم دین تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ نہ کبھی

مولانا کا لقب پسند کیا اور نہ ہی علامہ کا، لوگوں نے انہیں از خود امیر شریعت کا لقب دیا جبکہ انہوں نے اس لقب کو بھی اپنے نام و نمود کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ تقریر ہو یا کسی مغل میں گفتگو وہ ہر مقام پر اپنے آپ کو نیا تو صرف بخاری کہتے تھے۔ اور یا پھر عطاء اللہ شاہ۔ فرنگی حکومت ہو یا ہندو کا نگریس، انہوں نے کبھی بھی ان کے کسی التفات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، یہاں تک کہ انہوں نے عوام سے بھی اپنے لئے نہ کبھی چندہ مانگا اور نہ ہی کسی وظیفے کے خواستگار ہوئے ان کی شیر جیسی سرخ آنکھیں اس دنیا میں کسی کی بھی ممنون نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی جھکیں، دین ہو یا دنیا، انہوں نے اپنی ہر بات پروردگار پر چھوڑ رکھی تھی اور یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اور تجربہ ہے کہ انہوں نے اپنے رب سے بھی کچھ مانگا تو اس کی رضا مانگی، تسلیم مانگی، اور قناعت مانگی، وگرنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن ہمارے ہاں "قریشی مظفر گڑھ" میں تشریف فرما تھے، ان کے چند مرید بھی بیٹھے تھے کہ باتوں میں سے بات نکلی اور کہنے لگے کہ بعض اوقات میرے اوپر ایسی واردات بھی آتی ہیں کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں کسی دیوار کو بھی کھوں تو وہ آگے کی طرف پٹنے لگے۔

ان کی بے مثل خود داری نے انہیں قناعت عطاء کی اور اسی قناعت کی بنا پر نہ وہ کسی کے احسان مند ہوئے اور نہ ہی ممنون یہاں تک کہ جب ان کی وفات کے بعد ان کا جنازہ پڑھا جا چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہزاروں لوگوں نے شور مچا دیا کہ انہیں ملتان کے قلعہ کبہ پر دفن کر کے ان کا اونچا مزار تعمیر کیا جائے۔ اس بات کے لئے بہت سے با اثر افراد جو وہاں پر موجود تھے کہنے لگے کہ وہ ابھی جا کر کشمیر ملتان سے سرکاری طور پر اجازت لے آتے ہیں لیکن ان کے صاحبزادے سید عطاء السئم ابو معاویہ مدظلہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ان کے ابا جی نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کوئی چیز حکومت سے نہیں مانگی اور اب ان کی رحلت کے بعد ہم انہیں سرکاری اراضی کا مہوں منت نہیں ہونے دیں گے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تقریر کے بادشاہ تھے، اردو، پنجابی، فارسی، یہاں تک کہ عربی چاروں زبانوں کے الفاظ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح چاہتے استعمال میں لاتے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب ان کی تقریر شروع ہوتی تو صبح کی اذان ہو جاتی مگر نہ الفاظ ختم ہوتے اور نہ ہی معافی۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے اور مسور ہو کر بیٹھے رہتے۔ شاہ جی جب چاہتے تمام اجتماع کو ہنسا دیتے اور جب چاہتے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو کی جھریاں لگا دیتے۔ ان کی زبان ایک ایسی دودھاری ذوالفقار تھی کہ کاٹ کرتی تو انگریز اور ہندو، دونوں کی گردنیں اڑا دیتی اور طنز کرتی تو اپنوں کے سینوں میں اتر جاتی لطیفے بیان کرنے پر آتے تو سننے والے پہلے ہنس پڑتے اور پھر جب انہیں ان لطیفوں کی حقیقت کا علم ہوتا تو رو پڑتے

اور جب کسی ایسے کی داستان چھڑتے تو اس کے آخر میں کوئی ایک ایسا قدم چسپاں کر دیتے کہ لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائی دینے لگتیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی قوم کو کبھی مایوسی کی طرف دھکیلنے کی کوئی کوشش کی انہیں اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ انہیں اپنے ہادی ﷺ پر مکمل ایمان تھا۔ صحابہ کرامؓ کے پیروکار تھے اہل بیت ازواج رسول ﷺ کی تعظیم کا انہیں پاس تھا اور اولیاء کرام کی خدمات کے پورے طرح قائل تھے وہ بدعت کو بدعت کی حد تک رکھتے اور جیسا قیام پاکستان کے بعد علماء غلو پر اتر آئے جن میں سے بعض، بدعت کی مذمت میں حد سے بڑھ گئے اور بعض دوسرے بدعت کو بدعت کہنے سے ہی انکاری ہو گئے۔ شاہ نجی نے ان دونوں کو ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ سب کو مل کر مرزائیت کے کفر کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے دور میں تمام مکاتب فکر کے لوگ ان کے آگے زانوں تلخڑے کرتے۔ دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کی جو شکل قیام پاکستان کے بعد نظر آنے لگی ہے وہ ان کے دور میں کہیں نہیں تھی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے بہت سارے شیعہ مسلک کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کی تقریریں سنتے اور ان کی محفلوں میں آکر بیٹھتے۔

دہلی ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ شاہ جی وہاں آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں جمعہ کی چھٹی والے دن ان کے پاس پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں مجھے حکم فرمایا کہ کاغذ قلم سنبھالو اور جو کچھ میں کہوں لکھ کر اخبارات میں میری طرف سے بیان بھجوا دو۔ جب لکھواچکے تو فرمایا کہ اب مجھے پڑھ کر سناؤ۔ وہاں ایک جگہ گاندھی کا لفظ تھا جس کے آگے میں نے از خود مہاتما لکھ دیا تھا۔ فرمانے لگے اسے کاٹ دو اور صرف گاندھی جی لکھو۔ یہ واقعہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکا کانگریس کی طرف جھکاؤ ضرور تھا لیکن اتنا نہیں جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے اختلاف اٹھا اپنا تھا نہ کہ کانگریس کی پیروی میں تھا۔

وہ تو تمام جنوبی ایشیا کے برصغیر میں وادی کشمیر سے لیکر اس کھاری تکسکھ خلیج بنگال سے لیکر ورہ خیبر تک ان کے مرید اور معتقد لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ لیکن ان کے پیروکار جتنے جنوبی پنجاب میں تھے اتنے کہیں اور نہ تھے۔ میں بچہ تھا اور میرے والد صاحب مجھے ان کے جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انہی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کا ہجوم ان کی بیعت کے لئے تیار ہو جاتا تو ان کے حکم پر لوگ اپنی پگڑیاں اتار کے ایک دوسری سے گانٹھ لیتے اور اس طرح ایک طویل قطار بن جاتی شاہ جی کلمہ پڑھاتے اور لوگ ان پگڑیوں کو ہاتھ لگا کر کلمے کو دہراتے اور اس طرح خوش ہو کر مرید بن جاتے۔ دور دراز کے دیہاتوں میں حضرت شاہ جی جتنا سرکنڈے کے جھوپڑوں میں رہ کر خوش ہوتے اتنا کچے مکالوں میں نہ ہوتے بلکہ ہمارے ہاں جب بھی آتے تو سرکنڈے کے ایک چھپر میں رت بچا دی جاتی، پھر اس پر پانی کا چھمکاؤ کر دیا جاتا جس سے ہاڑ کی لوبھی ٹھنڈی ہو جاتی جہاں آپ قیام فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

اب ایک آخری بات۔ گرمیوں کے دن تھے اگست کا مہینہ تھا اور سال ۱۹۶۱ء تھا۔ میں جب صبح کو جاگا تو مجھے قبلہ شاہ جی کی یاد آنے لگی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ملتان جا کر ان سے ضرور ملاقات کروں گا۔